Defending Muhammad in Modernity

(عہد جدیدیت میں پیغمبر محمد ؐ کا دفاع)

By Dr. SherAli Tareen

وارث مظہری

ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی و اخلاقی زوال کے عہد میں مسلم ذہن میں جونئے سوالات پیدا ہوئے،ان میں سب سے اہم سوال یہ تھا کہ"وہ کون اور کیا ہیں"؟یہ سوال ان کی مذہبی و ثقافتی شناخت سے تعلق رکھتا تھا۔ مغل حکومت کے خاتمے اور استعمار ی تسلط کے استحکام کے بعد یہ سوال اوراس سے وابستہ دوسرے سوالات مسلم ذہنوں میں مستحکم ہوتے چلے ۔ان سوالات نے سب سے پہلے مسلم اور غیر مسلم کی تفریقی شناخت(binary) کو ابھارا،جومذہبی عقائد ورسوم سے ہٹ کرسیاسی وثقافتی تناظرمیں مغل بادشاہ اکبر(م،1605) کے بعد کافی مدھم ہوگئی تھی۔دوسری طرف خود داخلی سطح پرنئی ثقافتوں نے بال وپر نکالے جو نسل،علاقے اور زبان وغیرہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان شناختوں کے بعض نشانات مسلم عہد ماضی میں بھی موجود تھے۔لیکن استعماری عہد میں انہیں باضابطہ تشکیل پانے اور ترقی حاصل کرنے کا موقع ملا۔انہی داخلی شناختوں میں سے کچھ شناختیں وہ تھیں جنہوں نے اسلامی سیاست کے نظری وعملی تصورات کے تناظر میں خود کو عہد جدید کے تقاضوں سے مربوط رکھنے کی کوشش کی۔دیوبندی بریلوی تنازع اور کش مکش کواسی سیاق میں دیکھا جاسکتا ہے،جیسا کہ اس کتاب میں دیکھنے اور اس کی بنیاد پر حاکمیت (sovereignty)،دینیات(theology)،قانون واخلاق اور رسوم مذہبی پر مبنی بیانیہ تشکیل دینے کی کوشش کی گئی ہے جس کے تحت یہ دیکھا جاسکے کہ ہندوستان پر استعماری تسلط کے بعدان کے باہمی رشتوں کی نوعیت کیارہی اور انہوں نے مسلمانوں کی ایک نئی دینی اور تہذیبی شناخت کی تشکیل میں کیا رول ادا کیا؟اخلاقی وسیاسی زوال کے تناظر میں پیدا ہونے والی شناخت کی ان بحثوں کے تعلق سے یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اخلاقی زوال وانحطاط کی پہچان مسلم ثقافتی تاریخ میں ہمیشہ سیاسی زوال کے سیاق میں کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔اس لیے کہ اخلاقی زوال کوایک داخلی مسئلے کی حیثیت سے برداشت کیا گیا۔لیکن سیاسی زوال کو ہمیشہ خارجی دشمنوں کی سازش اور کرتوت سے تعبیر کیا گیا،جس کے خلاف فوری ردعمل ضروری تصور کیاگیا۔یہی صورتحال ہندوستان میں استعمار کے حملے کے وقت بھی نظرآتی ہے۔فرانسس رابنسن کے بقول اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کو اسلامی شناخت کی تشکیل پر آمادہ کرنے والے عوامل دو تھے: ایک عیسائی مشنریز کی تحرکات اورسرگرمیاں اور دوسرے ہندو احیا پسندی کا ابھرتا ہو ا جذبہ جومغل ایمپائر کے زوال کا شکار ہوجانے کے بعد اپنے ماضی کی بازیافت کے ذریعے اس کی جگہ لینا چاہتا تھا۔(رابنسن کا مقالہ: The British Empire and Muslim Identity in South Asia)۔رابنسن یہ بھی بتاتے ہیں کہ برطانوی استعمار کوجس چیز نے مذہبی اور فرقہ وارانہ بنیاد پر تشکیل دینے پر مجبور کیا وہ دراصل مسلم احیا پرستی تھی۔(یہ مقالہ jstor.org سائٹ پر موجود ہے۔P.274) لیکن انہوں نے خود اس سوال کو بہت حد تک نظر انداز کردیا کہ مسلم احیا پرستی کا یہ ظاہرہ خود برطانوی سامراج کی غلط سیاسی پالیسیوں کا نتیجہ تھی جوہندؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کواپنا اصل حریف تصور کرتے تھے۔

کتاب کے بنیادی مباحث

کتاب کا مرکزی موضوع جس سے کتاب کی تمام بحثیں جڑی ہوئی ہیں،یہ ہے کہ انیسویں صدی کے اوائل میں خداکی حاکمیت(divine sovereignty))،رسول کی اتھارٹی(Prophetic authority) اور مذہبی رسوم واعمال (ritual practices)سے متعلق جوسوالات احیائیت پسند(revivalists)مسلم گروہوں کی طرف سے اٹھائے گئے اور ان کو بحث میں لاکر اسلامی زندگی اور مسلم شناخت کی تشکیل وتعمیر کی کوشش کی گئی،وہ بنیادی طور پر اس کی سیاسی دینیات(political theology) سے وابستہ تھے۔ چناں چہ اقتدار، اخلاقیات،سماجی نظم ونسق،شرعی قوانین اور ان کے نفاذ کی شکلیں،سنت وبدعت اور رسوم وعادات کی فقہی وشرعی بحثیں براہ راست یا بالواسطہ طور پر اسی سے تعلق رکھتی ہیں۔(دیکھیے، کتاب کا پہلا باب) مصنف کی نظر میں بظاہر یہ بحثیں دینیاتی نوعیت کی تھیں لیکن ان میں چھپی لہریں اسلامی سیاسیات کے دھاروں سے ملی ہوئی تھیں۔(ص،42) مصنف نے اس کو اس زاو یے سے بھی دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ سیاسی دینیات نے دینیات

اور اس کے برعکس دینیات نے سیاسی دینیات کو کس طرح متاثر کیا ہے؟ بالفاظ دیگر سیاست اور دین کے باہمی تعلق وتعامل کی نوعیت کیا رہی ہے؟

اس ضمن میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ حقیقتا سیاست اور دین کے معاملے میں مسلم تاریخ میں سیاست ہمیشہ دین پر حاوی رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں دین کی تشریحات سیاسی ماحول کی تابع رہی ہیں۔ خلافت کے لیے قریشیت کی شرط سے لے کر ہندوستان میں متحدہ قومیت کے نظریے کی تشکیل تک سیاست دینی تشریحات پر حاوی نظر آتی ہے۔ہندوستان میں علما کی طرف سے مطالبے کے باوجود علاؤ الدین خلجی نے دین کو سیاست یا سیاسی مصالح پر حاوی ہونے سے روک دیا۔یہی پالیسی اکبر کی بھی رہی۔اورنگ زیب نے اس کے خلاف پالیسی بنائی لیکن وہیں سے مغلیہ عہد کا زوال شروع ہوگیا۔اس طرح فوکو(Foucault) کا یہ نظریہ بڑی معنویت کا حامل ہے کہ علم کی تخلیق (creation of knowledge)میں اصل کردار اقتدار(power) ادا کرتا ہے۔تاہم سیاست کی اس متغلبانہ فطرت کے باوجود اسلامی تاریخ میں دین وسیاست ایک دوسرے کے ہم قدم رہے۔ان میں باضابطہ دوئی اور مفارقت پہلی بار منگولوں کے ذریعے13 ویں صدی میں پیداہوئی اور دوسری بار یورپی استعمار کے ذریعہ17 ویں اور 18ویں صدی میں۔ تاریخ کے ان دونوں مرحلوں میں دین، قانون، اخلاق، روایت اور ثقافت کے حوالے سے اسلامی فکر میں نئے سوالات پیدا ہوئے۔اوائل 19ویں صدی میں ہندوستان میں جن سوالات کا مسلم فکر کوسامنا کرنا پڑا وہ یہ تھے کہ مسلم سیاسی اقتدار کے خاتمے اورعہد استعمار کے مضبوط ہونے کے بعد خدائی حاکمیت یا اقتدار کے تصور کا عملی اظہار یا اس کی بقا کس طرح ممکن ہے؟ خدا،رسول اور عام مسلمانوں کے درمیان تعلق کی جونوعیت بنتی ہے اس کو اب اس کوموجودہ سیاسی ماحول میں کس طرح دیکھا جانا ممکن ہے؟ اس عہد استعمار میں مسلم ثقافت اوراس کے شعائر کا تحفظ کس طرح ممکن ہوگا؟ مسلم روایت جومسلمانوں کی سیاسی وثقافتی تاریخ سے وابستہ ہے، اس کو استعمار کے متعارف کردہ جدیدیت سے،جواسلام کے داخلی مزاج سے مغایر ہے، کس طرح آمیزشوں سے محفوظ رکھا جاسکے گا؟(ص،37-41)

ڈاکٹرشیرعلی کی یہ کتاب جنوبی ایشیا کے عہد استعمار میں ان سوالات کے زیر اثر پیدا ہونے والی علمیاتی اوردینیاتی بحثوں کو ایک نیا زاویہ نظر فراہم کرتی اوردور جدید سے اس کی معنویت(relevance) کو آشکارا کرتی ہے۔یہ کام اس لیے اہم ہے کہ ان بحثوں کو عموماہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی واخلاقی زوال کے عہدکی فرسودہ بحثوں کے تناظر میں دیکھا اور ناقابل التفات سمجھا جاتا رہا ہے۔ان کی یہ بات بالکل درست ہے کہ یہ بحثیں سادہ مسلکی بحثیں نہیں تھیں بلکہ ان کی اساس competing rationality پر تھی۔(ص،377) لیکن اس rationalityکی تفہیم صحیح طور پر نہیں کی جاسکی۔وہ کہتے ہیں کہ سیاسی منظر نامے میں تبدیلی کے نتیجے میں مسلم دینیاتی فکر میں بھی ایک انقلابی تبدیلی پید ہوئی جس کے اظہارات بعد کی مسلم زندگی میں نظر آتے ہیں اور وہ تاحال اس علاقے میں راسخ العقیدگی کے گہرے تصور پر مبنی اسلامی شناخت کی تشکیل میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔(ص،45) مصنف کی وضع کردہ یہ دو اصطلاحات: competing theologyاور competing rationalityبہت معنی خیز ہیں۔ ان سے ان بحثوں کا فریم ورک اور ان کی معنویت سمجھ میں آتی ہے۔19 ویں 20ویں صدی میں پیدا ہونے والے مذہبی مباحثوں کی یہ تفہیم نئی اور تازہ ہے۔ ا س سے نئی بحثوں کوراہ ملتی ہے۔

کتاب کے پہلے حصے بعنوان:Competing Political Theologies میں اوائل انیسویں صدی میں محمد اسماعیل اور فضل حق خیر آبادی کے درمیان اور دوسرے حصے بعنوان :Competing Normativities میں اواخر انیسویں صدی میں علمائے دیوبند اور علمائے بریلی کے درمیان معرض بحث میں آنے والے موضوعات پر گفتگو کی گئی ہے۔ پہلے حصے میں جو سوالات اور مباحث زیر بحث آئے ہیں، ان میں چند اہم یہ ہیں:خدائی حاکمیت کے حوالے سے سیاسی ودینیاتی بحثوں کی نوعیت کیا تھی اور ان کے درمیان تعلق وتعامل کی کیفیت کیا رہی؟ سیاسی دینیات کے حوالے سے بحث ومباحثے کی جوروایت پروان چڑھی اس کی اہمیت ومعقولیت کیا ہے؟ اس تناظر میں امکان کذب وامکان نظیر، رسول اللہ کا صاحب شفاعت ہونا،اور حب رسول کے تصورات سے بحث کی گئی ہے جو اپنے مزاج اور خد وخال کے لحاظ سے دینیاتی بحثیں تھیں لیکن اس عہد میں جس سے کتاب بحث کرتی ہے، انہوں نے بہت حد تک خود کو دینی سیاسی نظریات میں مدغم کرلیا۔(ص،37-163)جب کہ دوسرے حصے میں مولد نبوی، علم غیب اور ان کے قبیل کے دوسرے ان موضوعات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے جنہوں نے دیوبندی اور بریلوی جماعت کی گروہی شناخت کومستحکم کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ان کے علاوہ مختلف مسلکی شناخت رکھنے والے ان دونوں گروہوں کے درمیان پائے جانے والے مشترکات کا بھی تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ (ص،167-331)اس طرح ان دونوں ابواب کے مطالعے سے جہاں ایک طرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کون سی نظریاتی بنیادیں ہیں جو ان کو الگ کرتی ہیں،وہیں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کن نظریات کی بنیاد پر ان دونوں گروہوں کی فکر ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوجاتی ہے؟

تیسرا باب:Intra Deobandi Tensions (اہل دیوبند کی داخلی کش مکش) مولانا امداد اللہ مہاجر مکی کی کتاب"ہفت مسئلہ" سے بحث کرتی ہے۔(ص،335-375) اس میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کتاب کے مندرجات کے حوالے سے کس طرح خود حلقہ دیوبند کے علما واصحاب فکر ان سے مخالفت یا موافقت کرنے والے دوخیموں میں بٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔اس طرح دیوبند کی سرحد بریلی اوربریلی کی سرحد دیوبند سے مل جاتی ہے اور یہ تفریقی شناخت کی منطق کمزورہوجاتی ہے کہ یہ دونوں جماعتیں ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔اپنے دینی تصور میں ایک اسلام کی بے لچک قانونی

روایت کی پاس دار ہے۔ جب کہ دوسری روحانیت اورفرد کے ذاتی تجربے کی بین مذہبی اور یونی ورسل روایت کی پاس دار ہے۔

کتاب اس نکتے کو بڑی خوبی سے مدلل کرتی ہے۔بریلوی اور دیوبندی دونوں دھاروں کے درمیان جوتنا زع رہا ہے اس کو اسلام کی صوفیانہ یا روحانی اور قانونی روایت کے درمیان کش مکش کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔اور اس بنیاد پر گڈ مسلم اور بیڈ مسلم کی binary بھی فرض کی جاتی رہی ہے۔خاص طور پر مغرب کے علمی وسیاسی حلقوں میں یہ روش عام ہے۔ اس کتاب میں تفصیل سے اس پہلو پرروشنی ڈالی گئی ہے کہ دونوں ہی اصلاح پسند جماعتیں ہیں۔ البتہ دونوں کے مواقف میں فرق یہ ہے کہ ایک(دیوبندی) ان رسوم کو جو ہندوستان کی عوامی زندگی کی پیداوار ہیں، اسلامی روایت کا حصہ تصور نہیں کرتی اور اس لیے اس کا استیصال کرنا چاہتی ہے جب کہ دوسری جماعت (بریلوی) اسلامی روایت کو وسیع تناظر میں دیکھتے ہوئے، جس کی تشکیل میں مقامی رسوم وعادات کا اپنا کردار ادا کرتی ہیں،اس روایت کو ضروری اصلاح کے ساتھ برقراررکھنا چاہتی ہے۔(ص256-264) اس طرح یہ دونوں جماعتیں اپنے بنیادی مقاصد اور سماجی کردار میں ایک دوسرے سے قریب ہوجاتی ہیں اور ان کے درمیان جو binary فرض کرلی گئی ہے، وہ باقی نہیں رہتی۔یہی وجہ ہے اور یہ نکتہ دل چسپ ہے کہ ہندوستان میں تیسری گروہی شناخت رکھنے والی جماعت:اہل حدیث ان دونوں جماعتوں: بریلوی اوردیوبندی کوایک دوسرے کا چربہ تصور کرتی اوردونوں میں کوئی فرق نہیں کرتی ہے۔جب کہ دوسری طرف بریلوی جماعت دیوبندی اور اہل حدیث دونوں جماعتوں کو وہابی تصور کرتے ہوئے اسلام کی سماجی،سیاسی اور قانونی روایت کے حوالے سے تطہیریت پسند اور منحرف تصورکرتی اور اس بنیاد پر ان کی تکفیر کرتی ہے۔ اس طرح دیوبندی جماعت ان جماعتوں کی شریک اور رقیب دونوں بن جاتی ہے۔

تاہم بریلوی دیوبندی کش مکش کی بنیاد جن دو بڑے مسائل (امکان کذب اور امکان نظیر)پر ہے، وہ نئے نہیں ہیں،جیسا کہ اس کتاب سے تاثر ملتا ہے۔خلف وعید کی بحث کے حوالے سے اشاعرہ امکان کذب کوقبول کرنے والے بن جاتے ہیں اور یہی نظریہ تشیع کے بعض گروہوں کا رہا ہے۔ امکان یا امتناع نظیر کا قول بھی شیخ شرف الدین یحی منیری سمیت مختلف اصحاب علم سے ثابت ہے۔(مکتوبات شیخ شرف الدین یحی منیری) اور اس نظریے کو عبد اللہ بن عباس کے ایک مشہور اثرسے تقویت حاصل ہوتی ہے جس کا ذکر شاید اس کتاب میں نہیں آسکا۔اس کے حوالے سے مولانا قاسم نانوتوی"تحذیرالناس" تحریر کی جو دیوبندی بریلوی اختلاف کی ایک بڑی کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس پر بھی کوئی گفتگو میرے خیال میں کتاب میں نہیں کی گئی حالاں کہ وہ اس کے موضوع سے کافی مربوط تھی۔

روایت کا تصور اور سماجی اصلاح کی بحث

روایت اور اصلاح کے تصور کے حوالے سے کتاب کی بحث بہت اہم ہے۔اس سے اختلافی مباحث پر مبنی علمی مناقشے کی روایت کا اندازہ ہوتا ہے، جسے مصنف نے competing theology کا نام دیا ہے۔دیوبندی،بریلوی دونوں اصلاح پسند جماعتیں ہیں لیکن دونوں کا اصلاح کے تعلق سے نقطہ نظر مختلف ہے۔دیوبندی نقطہ نظر قلب ماہیت یعنیtransformation کی قائل ہے۔اس کی نظرمیں روایت کو اسی شکل میں خرابی وفساد سے دور رکھا جاسکتا ہے اور اس میں زمانی ومکانی عوامل کے پیش نظر درآنے والی چیزوں کے راستے کو مسدود کیا جاسکتا ہے۔جب کہ بریلوی نقطہ نظرکے مطابق transformation کے بجائے جزوی اصلاح اصل اہمیت رکھتی ہے۔ یعنی تاریخ کے مختلف مراحل میں دینی روایت کا حصہ بننے والی رسوم وعادات جو اب معاشرے میں مستحکم ہوچکی ہیں،ان کے اس فاسد حصے کی اصلاح کی جائے جو دین کے مجموعی مزاج سے ناہم آہنگ اور اسلامی اخلاقی کے منافی ہیں۔(ص،297) بریلوی علما کے نزدیک روایت تاریخ کے کسی خاص مرحلے سے ہی صرف اپنا استناد اخذ نہیں کرتی بلکہ اس کی معتبریت اس کے اندر پائے جانے والے حسن وجمال کی صفت بھی ہے۔اس لیے روایت کی تشکیل ہردور میں مقامی اعمال وعادات سے اپنا مواد اخذکرتی رہے گی اور اس کی تشکیل میں ہرزمانے کے افراد اپنا حصہ ادا کرتے رہیں گے۔روایت کے استناد کو امت کے صرف ایک گروہ تک محدود رکھنا صحیح نہیں ہے۔ وہ ایک باغ کی طرح ہے جس کے حسن وزینت میں قیامت تک آنے والی نسلیں اپنا کردار ادا کرتی رہیں گی۔(ص،262)ماضی میں عادت کا مفہوم سنت کے بالمقابل نہیں تھا۔بلکہ وہ سماجی اقدار کے معنی میں تھا۔لیکن پیغمبرانہ اتھارٹی کے سوال کوایک نئے زاویے سے دیکھتے ہوئے اس کا مفہوم تبدیل ہوا اور اس نے ایک گروہ کے علما کی نظر میں بدعت کی شکل اختیارکرلی۔ دیوبندی اور بریلوی روایت پر تقابلی بحث کرتے ہوئے مصنف نے دیوبندیت کے حوالے سے ایک قابل غورنکتے کی طرف اشارہ کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ دیوبندی روایت میں یکسانیت کی جگہ تنوع(جس کو مخالف جماعت تضاد سے تعبیر کرتی ہے) کی شدید کیفیت پائی جاتی ہے۔اس تنوع کا ایک پہلو یہ ہے کہ بسا اوقات وہ باہم متضاد نظریات(conflicting ideological) کو اختیارکرلیتی ہے۔(ص،172)علمائے دیوبند اسے دیوبندیت کا اہم وصف شمار کرتے ہیں۔حقیقت میں دیوبندیت کی یہی وہ صفت ہے جس کی بناپر دیوبندیت نے ہمیشہ سیاسی ماحول سے اپنی مطابقت تلاش کرنے اور اس کے مطابق خود کو ڈھالنے کی کوشش کی۔اس کا اندازہ بجاطور پر اس سے ہوتا ہے کہ اس نے متحدہ قومیت اور سیکولرزم کے نظریاتی سانچے میں خود کوڈھال لیا اور جماعت اسلامی اور دوسرے نظریاتی گروہوں کی طرح کسی ذہنی تحفظ کاشکار نہیں ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ دیوبندیت کی یہ صفت شاہ اسماعیل سے متاثر ہوئے بغیر براہ راست شاہ ولی اللہ سے ماخوذ ہے۔اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ دیوبند کے متعدد فاضلین نے محمد اسماعیل کے اصلاحی ایجنڈے پر شدید نکیر کی اوراسے قبول نہیں کیا۔ ان میں دیوبندی اسکول کی اہم علمی شخصیت مولانا انور شاہ کشمیری اور مولانا حسین احمد مدنی جیسے لوگ شامل ہیں۔(سید حمد رضا بجنوری:املفوظات محدث کشمیری، ص،204-205) اس لیے میرے خیال میں یہ سمجھنا صحیح نہیں ہوگا کہ دیوبند اسماعیل کی علمی وراثت کا امین وپاس دار ہے۔ اور یہ کہ اصلاح کے حوالے سے اس نے اسماعیل شہید کی روایت کو آگے بڑھایا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دیوبند شاہ ولی اللہ کی اس متنوع اور وسیع روایت کی امین ہے جس میں کئی مختلف رنگ شامل ہیں جس میں سے ایک رنگ یا رجحان وہ ہے جس کو شاہ اسماعیل کے ذریعہ فروغ حاصل ہوا۔ اسماعیل کی روایت اور اصلاح کے تصور میں توحید کومرکزی اہمیت حاصل ہے۔ اور یہ تصور تجریدی اور بے لچک ہے۔ جب کہ شاہ ولی اللہ سے متاثر دوسرے گروہوں کے یہاں توحید کا تصور مرکزی نہ ہونے کے باوجود دوسرے تصورات (رسالت، حب رسول)غیر مرکزی اورضمنی نہیں ٹھہرتے بلکہ وہ اس مرکزی تصور کی مرکزیت کا حصہ بن جاتے ہیں۔

ڈاکٹرشیر علی کی یہ کتاب فکر کے نئے دریچوں کو کھولتی اور اس موضوع پر تازہ بحث کی راہ ہموار کرتی ہے۔Defending Muhammad in Modernity کی معنویت یہ ہے کہ وہ برصغیر ہند کی competing theology کی روایت کے مطالعے کا ایک نیا زاویہ پیش کرتی ہے اوراس کی معقولیت(rationality) کوسامنے لاتی ہے۔برصغیر ہند کے علمی حلقے ان مباحث ومناقشات کو ماضی کا حصہ تصور کرتے اور اسی تناظر میں ان کی افادیت وبصیرت کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب کہ یہ کتاب،غالبا پہلی مرتبہ، ان مباحث کودور جدید سے مربوط کرتے ہوئے ان کی معنویت کی تفہیم پرزوردیتی نظر آتی ہے۔تاہم میں سمجھتا ہوں کہ ان مباحث کی عصری معنویت پر مزید گفتگو کی گنجائش ابھی باقی ہے۔دورجدید میں ان کی معقولیت(rationality) کا سوال اپنی جگہ تشنہ ہے۔

چند ملاحظات

اپنی تمام ترخوبیوں کے ساتھ اس کے بعض پہلوکچھ سنجیدہ سوالات کھڑے کرتے ہیں۔پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ کتاب دیوبندی بریلوی اختلاف وکش مکش کو بنیادی طور پراسلامی سیاسیات کے تناظر میں دیکھتی ہے۔کتاب کا مفروضہ یہ ہے کہ انیسویں اور بیسویں صدی کے دورانیے میں خدائی حاکمیت،رسول کی استثنائی حیثیت یا ان کی اتھارٹی اورسماج میں شریعت کے نفاذ کے حوالے سے جوبحثیں پیدا ہوئیں،ان کو پیدا ہونے کا ماحول دراصل استعماری تسلط نے فراہم کیا تھا اور یہ تمام بحثیں دراصل اسی استعماری تسلط کے رد عمل میں اسلامی سیاسیات کے محور پر گردش کررہی تھیں۔اس مفروضے کا پہلا جز تویقینا صحیح ہے لیکن دوسرا جزبہت واضح حقیقت کا حامل نہیں۔ یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اسلام کی روایتی دینی فکر میں، جن پر یہ ساری بحثیں مرکوز ہیں، دین اور سیاست کے حدود الگ الگ نہیں ہیں۔ امامت صغری(نماز) کو امامت کبری(حکمرانی، خلافت) کا مقدمہ فرض کیا گیا ہے اور جمعہ وجماعت کا قیام بھی سیاست کا تابع ہے۔ہمیں اس نقطہ نظر سے تو یقینا اختلاف ہے لیکن مسلم دینیاتی فکر اسی پر مبنی ہے جس کو باضابطہ طور پر اسلامی تاریخ میں پہلی بار علی عبد الرازق نے گزشتہ صدی کے اوائل میں چیلنج کرنے کی کوشش کی۔استعماری دور میں دین اور سیاست کے تصورمیں عملی طور پر توضرور فرق آیا لیکن نظریاتی طور پر نہیں۔ محمد اسماعیل نئی رسوم اور بدعات کو خدائی حاکمیت کے تھریٹ کے طورپر دیکھ رہے تھے۔یا یہ کہ فضل حق خیر آبادی ایک سے زیادہ محمد کے ظہور میں آنے کی گنجائش (امکان نظیر) کورسول کی اتھارٹی(سیاسی معنوں میں) کے چیلنج کی شکل میں دیکھ رہے تھے،اس فکری فریم ورک کو قبول کرنابرصغیر ہند کے عام علمی حلقوں کے لیے آسان نہیں ہے۔ان کی نظر میں در حقیقت دینیاتی مسائل کو، جو اپنی مختلف شکلوں اور نوعیتوں کے ساتھ تاریخ میں ہمیشہ رہے ہیں، سیاسی معنی دے دیے گئے ہیں۔

اس تعلق سے جو بات اہمیت کے ساتھ سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر ہم اس پوری بحث کومغربی حلقہ فکر (Western Academia) میں رائج فکری وتحقیقی فریم ورک میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کریں تو بحث کا یہ ڈھانچہ بنتا اور یہی متوقع نتائج نکلتے نظر آتے ہیں۔لیکن اگر ہم اس بنے بنائے فریم ورک میں اس موضوع کے مطالعے کے بجائے خود اپنے طور پر اس کا مطالعہ وتجزیہ کریں توہمیں بحث کی وہ شکل بنتی اور وہ نتیجہ نکلتا ہوا دکھائی نہیں دیتا جو اس میں دکھانے اور نکالنے کی کوشش کی گئی ہے۔گویاایک covering law کے بطور جو’مفروضہ‘(hypothesis) یا presupposition تیار کیا گیا ہے، اس میں بہت کچھ اختلاف کی گنجائش باقی رہتی ہے۔